شذرات

برصغیر پاک و ہند میں برطانوی حکومت کی عمل داری سے پہلے، اُس زمانے کی ضرورتوں کے مطابق مسلمانوں کی تعلیم کا اچھا خاصا انتظام تھا۔ کم و بیش ہر مسجد میں بچّوں کو ابتدائی تعلیم دی جاتی تھی۔ اعلیٰ تعلیم کے لئے مدارس ہوتے، جن میں مختلف علوم و فنون پڑھائے جاتے۔ ان مدارس کی مالی کفالت عام طور پر اوقاف، معافیات اور رؤسا و اُمرا کے عطیات سے ہوتی تھی۔ علاوہ ازیں اہلِ علم کے بعض مشہور خاندان تھے، جن کے اپنے خصوصی مدرسے تھے، اور اُن میں اُس خاندان کے افراد نسلاً بعد نسلاً طلبہ کو تعلیم دیا کرتے تھے۔ جیسے مثال کے طور پر دہلی میں شاہ ولی اللہ صاحب کے والد بزرگوار شاہ عبدالرّحیم کا مدرسہ تھا۔ جس میں سب سے پہلے شاہ عبدالرّحیم صاحب پڑھاتے رہے، پھر اُن کی مسندِ تدریس پر شاہ ولی اللہ صاحب بیٹھے، اُن کے بعد اُن کی جگہ شاہ عبدالعزیز صاحب نے لی۔ اُن کا انتقال ہُوا، تو اُن کے نواسے شاہ محمّد اسحٰق صاحب مدرسہ رحیمیہ کے سربراہ بنے اور یہ سلسلہ اُس وقت تک جاری رہا، جب تک کہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں دہلی کا پُورا نقشہ ہی نہیں بدل گیا۔

اُس زمانے میں آج کی طرح دینی اور دُنیوی تعلیم کے مدارس الگ الگ نہیں ہوتے تھے، ایک ہی نظامِ تعلیم ان دونوں پر مشتمل ہُوا کرتا تھا۔

برطانوی عمل داری کی پہلی زد مسلمان رؤسا و اُمرا پر پڑی۔ اُن میں سے اکثر اپنی املاک سے محروم کر دیئے گئے۔ چنانچہ اسلامی درس گاہوں کی یہ آمدنی اس طرح بند ہوئی۔ اس کے بعد مدارس کے لئے جو اوقاف اور معافیات تھیں، وہ تمام ضبط کر لی گئیں۔ اور ان کا رہا سہا یہ سہارا بھی ختم ہو گیا۔ انگریزوں نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ اسلامی درس گاہوں کا وجود اُن کی نظروں میں کھٹکنے لگا۔ ان میں اُنھیں بغاوت کی بُو آتی تھی۔

غرض مسلمانوں کی درس گاہیں ایک ایک کر کے بند ہو رہی تھیں۔ روسا اور دولت مند طبقے افلاس کا شکار ہو رہے تھے، غریب مسلمانوں کا حال تو اور بھی بدتر تھا، ان حالات میں مسلمان بچے کہاں تعلیم حاصل کرتے۔ انگریزی حکومت کی طرف سے جو نئے مدرسے کھولے جا رہے تھے۔ اُن کی تعداد برائے نام تھی۔ اور پھر اُن میں دینی تعلیم کا کوئی انتظام نہ ہوتا تھا۔

ہمارے علمائے کرام کا اُمتِ اسلامیہ پر بہت بڑا احسان ہے، انھوں نے ۱۸۵۷ء کے بعد کے انتہائی ناسازگار حالات میں مسلمانوں اور خاص طور پر اُن کے غریب طبقوں کی عمومی اور اس کے ساتھ ساتھ دینی تعلیم کا بار اپنے کندھوں پر اُٹھایا، اور اجنبی حکومت کی مخالفت اور اہلِ ثروت طبقے کی اعانت سے محرومی کے باوجود برِّصغیر کے طول و عرض میں چھوٹے اور بڑے مدارسِ دینی کا ایک جال پھیلا دیا جن کی وجہ سے غریب سے غریب مسلمان طالب علم کے لئے یہ ممکن ہو گیا کہ وہ عمومی تعلیم کے ساتھ ساتھ دینی تعلیم بھی حاصل کر سکے۔ ذرا تصوّر کیجیے کہ اگر ہمارے علمائے کرام عمومی و دینی تعلیم کے میدان میں یہ قدم نہ اٹھاتے، تو آج ہمارے ہاں نسبتِ خواندگی کیا ہوتی!

ہمارے علمائے کرام کا یہ اتنا شاندار کارنامہ ہے کہ تاریخ اسے کبھی فراموش نہیں کر سکے گی۔

برطانوی عمل داری تو کبھی کی ختم ہو گئی، اب پاکستان میں ہماری خود اپنی قومی و اسلامی حکومت ہے۔ اب یہ حکومت تعلیم کو عام کرنے میں ہر ممکن کوشش کر رہی ہے۔ چنانچہ کوئی سال نہیں جاتا کہ یہ کثیر تعداد میں نئے مدارس نہ قائم کرتی ہو۔ اس کے علاوہ عمومی تعلیم کے ساتھ ساتھ دینی تعلیم کا بھی انتظام کیا جا رہا ہے، اور اس سلسلے میں تمام یونیورسٹیوں میں اسلامی علوم کی اعلیٰ تعلیم کے لئے خاص شعبے بھی قائم ہو گئے ہیں، مختصراً — وہ حالات، جن کی وجہ سے زیادہ سے زیادہ دینی مدارس کا قیام اور انھیں حکومت کی ہر طرح کی مداخلت، نگرانی اور سرپرستی سے آزاد رکھنا ناگزیر تھا، وہ کلیتہً بدل گئے ہیں — اب اس پر اصرار کہ ان مدارس پر خود دینی قومی و اسلامی حکومت کی بھی کسی طرح کی نگرانی نہ ہو، صحیح نہیں ہے، اس سے ملک و قوم کو جو نقصان ہوگا، وہ تو ہے ہی، لیکن خود یہ ان مدارس کے لئے بھی اچھا نہیں ہوگا، اور آگے چل کر ان کی افادیت بالکل

ختم ہو جائے گی۔

ہمارے علمائے کرام کو اس مسئلہ پر ٹھنڈے دِل سے سوچنا چاہیئے۔

آج اسلام ایک بڑی بین الاقوامی سیاسی قوت ہے، اور اسے اُن مسلمان حکومتوں کے علاوہ، جو سیکولرزم اور سوشلزم کی طرف زیادہ مائل ہیں، وہ غیر مسلم حکومتیں بھی تسلیم کرنے پر مجبور ہیں جن کا دُور سے بھی اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ پچھلے دِنوں ماہ ذی الحجہ میں مکہ معظمہ میں رابطہ عالم اسلامی کے زیر اہتمام ایک مؤتمر اسلامی منعقد ہوئی تھی، اُس میں بڑی کوششوں کے بعد ہندوستان اور ایبی سینیا کی حکومتوں نے اپنے ہاں کے مسلمانوں کے وفدوں کے لئے شرکت کی اجازت حاصل کی تھی، اس سے پہلے انڈونیشیا میں ایشیائی اور افریقی مسلمانوں کا جو اجتماع ہوا، اُس میں عوامی جمہوریہ چین کے مسلمان نمائندے بھی شریک ہوئے تھے۔ متحدہ عرب جمہوریہ تقریباً ہر سال قاہرہ میں ایک اسلامی اجتماع منعقد کرتا ہے، جس میں تمام مسلمان ملکوں کے اہلِ علم کو مدعو کیا جاتا ہے۔

پاکستان کا ایک اسلامی ملک ہونے کی حیثیت سے ان بین الاسلامی اجتماعات میں ایک خاص مقام ہوتا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ اس طرح کے اجتماعات برابر ہوتے رہیں گے اور پاکستان کو ان میں زیادہ سے زیادہ موثر اور فعّال نمائندگی کرنا ہوگی۔

ہمارے علمائے کرام کو اپنے محدود فقہی و نظری دوائر سے اب باہر نکلنا چاہیئے۔ انگریز کے دورِ حکومت میں اُنھیں اسلام کا دفاع کرنا تھا، اور دفاع کے لئے ایک خاص طرح کے ذہن کی ضرورت ہوتی ہے۔ اب وہ ایک آزاد، ترقی پذیر اور وسعت خواہ اسلامی ملک کے دینی رہ نما ہیں، اُن کے سامنے اس ملک کے اندر اور اس کے باہر بین الاسلامی اجتماعات میں اپنی بات کہنے کے وسیع مواقع ہیں، اُنھیں ان مواقع سے فائدہ اُٹھانا چاہیئے۔

واقعہ یہ ہے کہ اسلام کی نمائندگی جتنی اچھی ہمارے
علمائے کرام کر سکتے ہیں، اور کوئی نہیں کر سکتا!